اشاعت نمبر:35

امام نسفی رحمتہ اللہ علیہ

اور

امام احمد رضا رحمتہ اللہ علیہ

مفتی فیضان المصطفیٰ قادری (امریکہ)

راشد انصاری قادری رضوی

fb/ahlesunnat25, fb/stmujahidnews, telegrame.me/sunninews92

فیضانِ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان رحمتہ اللہ علیہ کراچی پاکستان

رضویات

قسط سوم

امام احمد رضا اور اکابر امت کا دفاع

تحریر: مفتی فیضان المصطفیٰ قادری (امریکہ)

امام نسفی اور امام احمد رضا

زیر نظر مضمون میں ہم امام احمد رضا قدس سرہ کے ان کلمات کا خلاصہ درج کریں گے جو انھوں نے کنزالدقائق اور تفسیر مدارک کے مصنف امام ابوالبرکات النسفی کے دفاع میں تحریر کیے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ علامہ فضل رسول بدایونی علیہ الرحمہ نے ''المعتقد المنتقد'' میں نبوت کے بیان میں امام نسفی کی ایک عبارت پیش کر کے ایسی تنقید کی ہے جس سے امام نسفی پر ''تشبہ بالاعتزال'' کا الزام آتا ہے۔ جس پر امام احمد رضا قدس سرہ باوجودیکہ نفسِ بحث میں مصنف سے اتفاق رکھتے ہیں اور امام نسفی سے اتفاق نہیں کرتے، اعتزال والی بات گوارا نہیں کرتے اور امام نسفی کے دفاع میں بڑا تفصیلی کلام کرتے ہیں۔

نقطۂ اختلاف علم کلام کا ایک دقیق مسئلہ ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ پر انبیائے کرام کو مبعوث کرنا واجب ہے؟ یا نہیں؟ اشاعرہ اور ماتریدیہ کے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کا فضلِ محض ہے کہ اس نے انبیائے کرام مبعوث فرمائے، ورنہ اس پر کچھ بھی واجب نہیں، لیکن معتزلہ اسے اللہ تعالیٰ پر واجب قرار دیتے ہیں، جس کی بنیاداُن کا یہ اصولی مسئلہ ہے کہ ''اصلح للعباد'' یعنی ایسا کام جس میں بندوں کی بہتری ہو اللہ تعالیٰ پر واجب ہے۔ امام ابوالبرکات نسفی کی ''عمدۃ العقائد'' کی ایک عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بھی وجوب کے قائل ہیں، جس کے پیش نظر علامہ فضل رسول بدایونی علیہ الرحمہ نے اسے ان کی لغزش، خلافِ حق، لائقِ ردّ اور اعتزال سے اختلاط کا نتیجہ قرار دیا ہے۔

علامہ فضل رسول بدایونی علیہ الرحمہ کے اس تبصرہ کے باقی حصوں سے امام احمد رضا کو اتفاق ہے، لیکن ''اعتزال سے اختلاط'' والی بات آپ کو تسلیم نہیں۔ امام احمد رضا کے نزدیک اگر امام نسفی کی بات کی تاویل ہوسکتی ہے تو کیوں نہ کی جائے! چنانچہ آپ نے اس کی تاویل کی ہے، جس کے لیے دقیقہ سنجی اور باریک بینی کو بروئے کار لاتے ہوئے فکر ونظر کو پوری جولانیت دی ہے، جس کے سبب یہ بحث ''المستند المعتمد'' کے کئی صفحات پر پھیل گئی ہے، ہم ذیل میں پہلے امام نسفی کا مختصر تعارف پیش کرتے ہیں تاکہ اندازہ ہو کہ امام احمد رضا نے کیوں ان کے قول کی تاویل میں اس قدر جگر کاوی سے کام لیا ہے۔

امام ابوالبرکات النسفی رحمہ اللہ

امام حافظ الدین عبداللہ بن احمد بن محمود ابوالبرکات النسفی ساتویں صدی ہجری کی عظیم علمی شخصیت کا نام ہے جو زہد وتقوی اور علم وتحقیق میں ممتاز حیثیت کے حامل تھے، فقہ واصول کے عبقری، عربی زبان وادب کے ماہر اور تفسیر قرآن میں استاذ تھے، علامہ ابن حجر عسقلانی نے انھیں ''علامۃ الدنیا'' کہا، اسی وجہ سے امام نسفی کو اپنے عہد کے فقہا و متکلمین دونوں میں یکساں مقبولیت حاصل ہے۔ علامہ ابن کمال پاشا نے انھیں مقلدین کے اصحاب تمیز کے طبقہ میں شمار کیا ہے، اور فرمایا: **وبہ اختتم الاجتھاد ولم یوجد بعدہ مجتھد فی المذاھب۔**

آپ ایک عظیم مصنف ہیں، آپ کی متعدد کتابیں علمی دنیا میں

متون کی حیثیت رکھتی ہیں ،فقہ میں مذہب امام ابوحنیفہ کے پیروکار تھے۔مذہب حنفی کا متن کنزالدقائق ،نورالانوار کا متن ''المنار'' اور تفسیر قرآن ''مدارک التنزیل'' آپ کی شہرۂ آفاق تصنیفات ہیں جو درس نظامی کا حصہ ہیں،اسی طرح کافی شرح وافی نے بھی آپ کو شہرت دوام عطا کیا ہے۔عقیدہ میں آپ ماتریدی ہیں اور آپ کی کتاب عمدۃ العقائد علم کلام کی مستند کتاب مانی جاتی ہے،ان کے علاوہ بھی ان کی تصنیفات کی ایک لمبی فہرست ہے جس کے پیش نظر کہا جاسکتا ہے کہ اسلام و مسلمین کی گزشتہ آٹھ سو سالہ علمی تاریخ امام نسفی کے زیر احسان ہے۔ان کی وفات ۷۱۰ھ میں ہوئی۔

ان کی کتاب کنزالدقائق اس قدر مقبول ہوئی کہ ماہرین فقہ نے اس کی ضخیم ضخیم شرحیں لکھیں، جن میں امام زین بن نجیم مصری کی البحرالرائق ،علامہ فخرالدین الزیلعی کی تبیین الحقائق اور علامہ عمر بن نجیم کی النہرالفائق کو قبول عام حاصل ہوا،اصول فقہ میں ان کی کتاب المنار کی شرحوں کا اندازہ لگانا مشکل ہے ،جن میں نورالانوار درس نظامی کا حصہ ہے۔عقیدہ میں آپ کی کتاب عمدۃ العقائد ہے جو بعد کی کتب کلامیہ مثلاً شرح عقائد نسفیہ شرح مقاصد ،شرح مواقف ، مسایرہ مسامرہ وغیرہ کا مرجع وماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔واضح رہے کہ عقائد نسفیہ جس کی شرح للتفتازانی درس نظامی کا حصہ ہے وہ امام ابوالبرکات النسفی کی تصنیف نہیں، بلکہ وہ علامہ ابوحفص عمر بن محمد النسفی کی تصنیف ہے۔

اتنے عظیم محسن اور عبقری شخصیت کی باتیں اگر خلاف واقعہ بھی ہوں تو بھی بے وزن نہیں قرار دی جاسکتیں،اور اگر ان کی کسی بات کو اعتزال کا اثر قرار دیا جائے تو پھر ان کی اس قدر علمی وراثت پر اعتماد متاثر ہوگا۔اس لیے امام احمد رضا نے اس مقام پر امام نسفی کا دفاع کرنا ضروری سمجھا۔

اب ہم اصل بحث کا رخ کرتے ہیں،ہمیں اندازہ ہے کہ اس بحث کے علمی دقائق کے پیش نظر ہمارے کچھ قارئین اس کے متحمل نہیں، لیکن ہم حتی الامکان آسان الفاظ میں پیش کریں گے تاکہ ہمارے قارئین کو اندازہ ہو جائے کہ اکابرین امت کی بات آجائے اور تاویل ہو سکتی ہو تو ضرور کرنی چاہیے اور حتی الامکان تغلیط سے پرہیز کیا جانا چاہیے،یہی اعلیٰ حضرت کا علمی مزاج ومسلک ہے۔

علامہ فضل رسول بدایونی علیہ الرحمہ نے المعتقد میں نبوت کے بیان میں لکھا کہ'' امام نسفی العمدۃ میں لکھتے ہیں کہ رسولوں کو انذار وتبشیر کے ساتھ بھیجنا ممکن بلکہ واجب ہے جس سے ظاہر ہے کہ اس کا نہ ہونا محال ہے۔انتہیٰ۔یہ علامہ نسفی کی لغزشوں میں سے ایک لغزش ہے اور ان کا اعتزال سے مل جانا ہے اور یہ تمام اپنے ظاہری معنی کے مطابق خلاف حق اور قابل رد ہیں''۔

(وقال النسفي في العمدة: ارسال الرسل مبشرين ومنذرين في حيز الامكان بل في حيز الوجوب والظاهر استحالة تخلفه انتهى، وهذا من جملة زلات النسفي واختلاطه مع الاعتزال، والكل مردود على ظاهره ومخالف للحق.

(المعتقد المنتقد ص۹۸ مطبوعة المجمع الاسلامي مبارکفور)

امام احمد رضا کی تحقیق کا خلاصہ

اس پر امام احمد رضا قدس سرہ العزیز نے حاشیہ لگایا اور پوری تفصیل سے کلام فرمایا جس کو آسانی کے لیے ہم تین حصوں میں پیش کرتے ہیں: (۱) تمہید (۲) امام نسفی کے قول کی تاویل وتوضیح (۳) ان کے نظریۂ وجوب کا رد۔

تمہید:

اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں کہ اس مقام پر امام نسفی کے موقف کا معتزلہ سے خلط ملط ہو جانا درست نہیں، بلکہ دونوں میں بڑا فرق ہے، اور تاویل کرنا بہتر ہے جس کا دروازہ بند نہیں ہے۔اور امام ابوالبرکات النسفی ان جیسے کلمات میں منفرد نہیں، بلکہ ہمارے کئی مشائخ ماتریدیہ

اس مقام پر ان کے موافق ہیں۔اور اگر قال سے حال کی طرف چلیں تو اکابر صوفیا بھی ان سے متفق ملیں گے، حاشا وکلا! کہاں وہ اعاظم واکابر! اور کہاں معتزلہ کی گمراہی!۔تو میں چاہتا ہوں کہ امام نسفی کے کلام کا مناسب محمل بیان کروں اگر چہ اس مسئلہ کے اکثر فروع میں ہمارے نزدیک پسندیدہ ومختار وہی ہے جسے مصنف (علامہ فضل رسول بدایونی علیہ الرحمہ) نے اختیار کیا ہے۔

فاقول وباللہ التوفیق: باری تعالیٰ سے اس کے افعال کے صدور میں لوگوں کے مختلف نقطہائے نظر ہیں:

فلاسفہ اسے واجب کہتے ہیں یعنی ایسا کہ ترک کا اختیار نہیں۔ یہ کھلا ہوا کفر ہے۔معتزلہ اور روافض چند افعال کو باری تعالیٰ پر واجب قرار دیتے ہیں۔ ہمارے تمام ائمہ اہل سنت وجماعت فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر کچھ بھی واجب نہیں۔ وہ حاکم ہے اس پر کوئی حاکم نہیں، اس کی قدرت بمعنی فعل وترک فعل دونوں کی نسبت اس کی طرف برابر ہے کسی کو دوسرے پر ترجیح حاصل نہیں، صفت ارادہ ہے جو ایک کی دوسرے پر ترجیح کا سبب ہے۔اس قدر اجماعی ہے۔

اب اہل سنت وجماعت میں حسن وقبح کے عقلی ہونے میں اختلاف ہوا، اشاعرہ نے اس کا مکمل انکار کیا اور اس کا اتنا رد کیا کہ اذہان میں یہی راسخ ہو گیا، حتی کہ اُس نکتے سے بھی غفلت ہوئی جس پر اتفاق تھا، اور یہ لوگ امتناع الکذب جیسے امور کی اس تعلیل میں پریشان ہوئے کہ یہ نقص ہے جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ پر محال ہے۔

چونکہ اشاعرہ نے حسن وقبح کے عقلی ہونے کا انکار کیا اس لیے مطیع کو ثواب دینا، کافر کو عذاب دینا، رسولوں کی جماعت بھیجنا، محال کا مکلّف بنانا وغیرہ کچھ بھی ان کے نزدیک حکم شرع سے پہلے نہ حسن ہے نہ قبیح ہے۔ تو ان کے مطابق کسی کام کی خوبی حکم وارد ہونے کے بعد معلوم ہوگی، یوں ممکنات کی نسبت ''حکمت وارادہ'' کی طرف بھی بالکل ویسی ہی ہے جیسی ''قدرت'' کی طرف ہے، کیوں کہ ان کے مطابق فعل فی نفسہ حکمت کے موافق یا مخالف ہونے سے عاری ہے جب تک کہ صفت ارادہ اس کا تقاضا یا منع نہ کرے۔

ہمارے ائمہ ماتریدیہ نے درمیانی راہ اختیار کی، یعنی یہ کہ حکم صرف اللہ تعالیٰ کا ہے، اور مختلف افعال کے اندر بذات خود حسن وقبح کی صفات پائی جاتی ہیں، عقل اس کا ادراک مستقلاً کر سکے یا نہ کر سکے، بعض وہ افعال ہیں جو موافق حکمت ہیں مثلاً نیکوں کو ثواب دینا اور کافروں کو عذاب دینا، بعض مخالف حکمت ہیں جیسے ان کے برعکس یعنی نیکوں کو عذاب اور کافروں کو ثواب دینا۔ اور کوئی چیز کبھی بذات خود تو ممکن ہوتی ہے لیکن کسی غیر کے سبب محال ہو جاتی ہے، یعنی ممکن ذاتی ' محال بالغیر ہو سکتی ہے، اس لیے ''محال وقوعی'' اگر فی نفسہ ممکن ہے وہ باری تعالیٰ کا مقدور ہے۔لیکن صفتِ ارادہ سے تعلق ''امکانِ وقوعی'' پر موقوف ہے، کیوں کہ جس کا وقوع ممکن نہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کی مراد نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ تحتِ قدرت ہونے سے یہ لازم نہیں کہ مقدور وجود میں آجائے، برخلاف ارادۂ الٰہیہ کے' کہ وہ کسی چیز سے متعلق ہو جائے تو وہ چیز ضرور معرض وجود میں آجائے گی۔

امام نسفی کے قول کی تاویل وتوضیح:

جب اس قدر باتیں معلوم ہو گئیں تو واضح ہے کہ تمام ممکنات تحت قدرت الٰہی ہیں، خواہ حکمت باری کے موافق ہوں یا نہ ہوں، لہٰذا جبر وایجاب نہیں۔لیکن صفت ارادہ کا تعلق ان میں اسی ممکن سے ہو سکتا ہے جو موافق حکمت ہو ورنہ سفہ لازم آئے گا جو کہ باری تعالیٰ کے لیے محال ہے۔ تو جو موافق حکمت ہو وہ باری تعالیٰ کی طرف سے حیز وجوب میں ہوگا (وجوب منہ) کیونکہ وہ اس کے ارادہ واختیار سے صادر ہوا ہے۔ وہ وجوب (وجوب علیہ) نہیں جس کا مطلب ہے کہ خلاف پر قدرت نہیں' جس کے قائل فلاسفہ ہیں۔اور وہ ''وجوب علیہ'' بھی نہیں جس کے قائل معتزلہ اور روافض ہیں۔ اسی طرح جو ممکن حکمت باری تعالیٰ کے خلاف ہے وہ ممتنع بالغیر کی حیز میں ہوگا کیوں کہ اس کا مراد الٰہی ہونا محال ہے حالانکہ وہ مقدور الٰہی ہے۔ تو امر واضح ہو گیا اور اشکال دور ہو گیا اور مذکورہ علما اور معتزلہ کے قول وجوب

افعال باری میں فرق واضح ہوگیا۔

اس کے بعد اعلیٰ حضرت نے علامہ بحرالعلوم کی فواتح الرحموت اور شرح مسلم سے عبارتیں پیش کیں جس میں علامہ نے فعل باری تعالیٰ کے لیے وجوب کا لفظ استعمال فرمایا، اس کے بعد فرماتے ہیں: **فاستبان معنی الوجوب الخ** یعنی جس وجوب کا قول ان بزرگوں نے ان مقامات پر کیا یہ ''اعتزالی وجوب'' یا ''فلسفی وجوب'' نہیں ہے، بلکہ یہ وجوب سنی حنفی ہے۔

یہاں تک تو اصولی بحث تھی، اب فروع کا معاملہ ہے۔ چنانچہ اس معاملہ میں نظریاتی اختلاف ہوا کہ بعض افعال حکمت کے منافی ہیں تو محال بالغیر ہوئے اور بعض حکمت کے مطابق ہیں تو واجب بالغیر ہوئے۔ جیسے امام نسفی کے نزدیک کافر کو معاف کرنا، اور جمہور کے نزدیک تعذیبِ مطیع محال بالغیر ہے، یو ہیں امام نسفی کے نزدیک ارسال رسل اور جمہور کے نزدیک اثابت مطیع واجب بالغیر ہیں۔ یہ ان علما کے نظریات کی تقریر ان کے کلام کے مطابق تھی۔

نظریۂ وجوب کا رد:

اس کے بعد اعلیٰ حضرت نظریۂ وجوب کا رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

فاقول مستعینا بالجلیل: اللہ تعالیٰ کے تمام افعال اس کے حکمت بالغہ کے موافق ہوتے ہیں، جو اس نے کیا وہ کسی نہ کسی حکمت کی وجہ سے کیا اور جو ترک فرمایا وہ کسی حکمت کے سبب ترک فرمایا۔ ہر فعل وترک میں اس کی حکمتیں ہیں جنھیں وہی جانتا ہے، اور بلاشبہ کسی چیز کا حکمت کے منافی ہونا اسے محال بنا دیتا ہے۔ لیکن کسی چیز کا حکمت کے موافق ہونا اسے واجب کردے ایسا ضروری نہیں، جیسے کہ ایک فعل اور اس کا خلاف' دونوں میں حکمت ہو تو ہر دونوں فعل میں حکمت کی موافقت پائی جاتی ہے، پھر بھی دونوں میں سے کوئی بھی واجب نہیں، مثلاً اللہ تبارک وتعالیٰ کسی گنہگار کو سزا دے تو وہ سزا عدل اور حکمت کے طور پر ہوگی اور اگر معاف کردے تو یہ اس کی حکمت بالغہ اور بخشش ومہربانی کے طور پر ہوگی۔ جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام عرض کرتے ہیں: اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُکَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ. اس آیت کریمہ میں مغفرت کے ساتھ ''العزیز الحکیم'' کے ذکر سے اشارہ ہے کہ مغفرت بھی عین حکمت ہے۔ حالانکہ بادشاہوں کے دربار میں باغیوں کا گروہ پیش کیا جائے تو خواہ وہ بادشاہ کتنے ہی مہربان اور عفو وکرم والے کیوں نہ ہوں انھیں معاف نہ کریں گے، یا تو اس ڈر سے کہ کہیں یہ باغی پھر غالب نہ آجائیں، یا پھر دشمنوں پر قابو پا کر چھوڑ دینے کی حماقت سے بچنے کے لیے، اللہ رب العزت تو ان تمام باتوں سے بری اور غالب ہے اس پر کوئی غالب نہیں آسکتا،

تو اس کے تمام افعال وتروک یقیناً حکمت کے مطابق ہیں اور ہوسکتا ہے کہ کچھ افعال ایسے ہوں جنھیں حکمت' محال اور اس کا ترک واجب قرار دے، اگرچہ قدرت ان دونوں کو شامل ہو۔ لیکن ہم کوئی ایسا فعل نہیں سمجھتے جسے حکمت واجب اور اس کا ترک محال قرار دے، باوجود اس کے کہ قدرت ان دونوں کو شامل ہو، ہاں ایسا علم واخبار کے اعتبار سے ہوسکتا ہے، اسی وجہ سے میں کہتا ہوں کہ مطیع کی تعذیب محض محال ہو تو مطیع کو ثواب دینا عقلاً واجب نہیں ہوجاتا، اگرچہ سمعاً واجب ہے، جیسا کہ ارشاد ہے کہ ''یہ میرا فضل ہے میں جسے چاہوں دوں''۔ یو ہیں تعذیب کافر، ارسال رسل، اور انزال کتب سب حکمت کا تقاضا ہے، مگر ایسا نہیں کہ یہ تقاضائے حکمت انھیں حیز وجوب تک پہنچا دے، اللہ کی شان یہ ہے کہ جو چاہتا ہے پیدا فرماتا ہے اور جو چاہے کرے۔

یہ میری غور وفکر کا حاصل ہے اگر درست ہے جیسا کہ مجھے امید ہے تو اللہ کی طرف سے ہے اور اس میں خطا ہے تو میں اللہ کی بارگاہ میں ہر خطا سے توبہ کرتا ہوں اور جو رب کے نزدیک حق ہے اس سے دل وابستہ کرتا ہوں۔ وہو حسبی ونعم الوکیل۔

(ملخصاً المعتمد المستند صفحہ ۹۸ تا ۱۰۵)

مذکورہ بحث امام احمد رضا قدس سرہ العزیز کے حاشیہ المعتمد المستند سے ماخوذ ہے، اس ضمن میں آپ نے بہت گوشوں پر کلام کیا

ہے، ہم نے صرف مرکزی نکات ذکر کیے ہیں۔ جنھیں اصل عبارت سے علمی حظ لینے کا شوق ہو وہ اس مقام کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

چونکہ ان نگارشات کا مقصد یہ معلوم کرنا ہے کہ امام احمد رضا قدس سرہ کا ردعمل اُس وقت کیسا ہوتا ہے جب وہ کسی بزرگ کے ایسے ریمارکس تک پہنچتے ہیں جو دوسرے بزرگ تر کے خلاف ہوں، تا کہ انھیں نکات کو اعلیٰ حضرت کا علمی و عملی مسلک ومزاج سمجھ کر ہم بھی اختیار کریں۔ لہٰذا ذیل میں ہم وہ نکات ذکر کرتے ہیں جو اس بحث سے ابھر کر سامنے آتے ہیں:

حاصل نکات:

(۱) پوری بحث کے خلاصے کے طور یہ بات سامنے آتی ہے کہ انبیائے کرام کی بعثت اللہ تعالیٰ کا فضل خاص ہے، یا اللہ پر واجب ہے۔ اول الذکر اہل سنت و جماعت کا موقف ہے اور آخر الذکر معتزلہ کا۔ امام نسفی کی ایک عبارت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ بھی واجب مانتے ہیں، اسے مصنف بھی غلط مانتے ہیں اور محشی بھی، لیکن مصنف نے اس خطا کو معتزلہ سے اختلاط کا نتیجہ قرار دیا ہے اس پر امام احمد رضا کو اعتراض ہے اور آپ نے اس پر پورا قلمی زور صرف کر دیا ہے کہ اگر امام نسفی کے قول کی تاویل ہو سکتی ہو تو اعتزال سے اختلاط کا الزام کیوں دیا جائے؟

(۲) پوری بحث سے یہ بھی واضح ہوا کہ وجوب کا قول صرف امام نسفی کا نہیں بلکہ چند اور ائمہ ماتریدیہ بلکہ صوفیائے کرام سے بھی وارد ہوا، اس پر امام احمد رضا نے جو تحقیق پیش کی اس سے اندازہ ہوا کہ ان ائمہ ماتریدیہ کا ''وجوب'' معتزلہ کے ''وجوب'' سے بہت مختلف ہے، اول کو ''وجوب منہٗ'' اور ثانی کو ''وجوب علیہ'' سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، ان دونوں کا فرق بہت واضح ہے کہ پہلا وجوب بالاختیار ہے جو منافیٔ اختیار نہیں اور دوسرا منافیٔ اختیار ہے، تو دونوں کو یکساں اور خلط ملط کا نتیجہ کیسے کہا جا سکتا ہے؟

(۳) المعتقد کے مصنف علامہ فضل رسول بدایونی اور اس کے محشی امام احمد رضا قدس سرہما دونوں بزرگ، مذہب ومسلک ومشرب ہر اعتبار سے ایک مذاق ومزاج رکھتے ہیں اور محشی ہر مقام پر مصنف کی تائید وحمایت کرتے ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اگر مصنف سے کوئی ایسا ریمارک سرزد ہو جائے جس سے کسی عظیم تر شخصیت پر حرف آتا ہو تو اسے محض اس لیے نظر انداز کر دیا جائے کہ اصول وفروع میں اتفاق و یگانگت کے ماحول میں چھوٹی سی بات برداشت کر لینی چاہیے اور بزرگ کی عزت وحرمت کو نظر انداز کر دیا جائے۔

(۴) امام نسفی علیہ الرحمہ کے قول کی تاویل میں امام احمد رضا قدس سرہ نے خاصی فکری توانائی صرف کی ہے اور بحث کو کئی صفحات پر پھیلایا ہے، جسے پڑھ کر گمان ہونے لگتا ہے کہ یہی موقف حق ہے، مگر آخر میں اعلیٰ حضرت نے امام نسفی کے اس موقف کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ کوئی فعل، حکمت الٰہیہ کے خلاف ہو تو وہ محال تو ہوگا لیکن یہ ضروری نہیں کہ کوئی فعل حکمت کے موافق ہو تو واجب ہو جائے، لہٰذا ہمارے رب پر کچھ بھی واجب نہیں، وہ فاعل مختار ہے۔ یعنی جس کی تاویل میں اس قدر مفصل کلام کیا اسے بالآخر رد کر دیا، گویا پوری بحث کا حاصل بس اس قدر ہے کہ امام نسفی پر ان کے ایک ''نادرست قول'' کی بنا پر اعتزال کا الزام نہ دیا جائے، اور اس کی تاویل کی جائے، اکابر کی حرمتوں کی پاسداری کی یہ اعلیٰ مثال ہے۔

(۵) اس بحث کے شروع میں اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ اس سے پہلے بھی مصنف نے امام نسفی پر کچھ نقد کیے تھے جنھیں ہم نے چند وجوہ سے نظر انداز کر دیے، اس کی ایک وجہ یہ فرمائی کہ بات اتنی بڑی نہ تھی کہ اس پر عام لوگوں کو توجہ دلائی جائے۔ (**قد سكتنا عليه فيما سبق من بعض تعاليقنا مشياً على الظاهر المتبادر وحذاراً للعثار على الناظر القاصر. صفحہ ۹۸**) امام احمد رضا قدس سرہ کے اس طرز عمل کا حاصل یہ ہے کہ کسی خلافِ حق مسئلے کو لوگوں کی دانست میں اُسی وقت لانا چاہیے جب ایسا کرنا ضروری ہو، ورنہ ہر کس و ناکس کے سامنے ہر بات پر رد وقدح اور نکیر، حکمت کا تقاضا نہیں۔

☆☆☆

(۳) اس عقیدہ کے کوئی راوی سوء فہم کا شکار نہیں ہوئے۔	(۳) راوی سوء حفظ کا شکار ہوئے۔
(۴) یہ عقیدہ ایمانیات میں داخل ہے۔	(۴) یہ عقیدہ ایمانیات میں داخل نہیں۔
(۵) اللہ کی صفات تقدیر رسالت ختم نبوت حیات عیسیٰ علیہ السلام وغیرہ تمام عقائد اسلامیات میں داخل ہے۔	(۵) تقدیر اللہ کی صفات ختم نبوت وغیرہ کی طرح یہ مسئلہ عقائد اسلامیہ میں داخل نہیں ہے۔
(۶) حیات مسیح عقیدے کا مسئلہ ہے۔	(۶) یہ مسئلہ عقیدے کا نہیں ہے۔
(۷) اس عقیدے کا منکر کافر و ملحد ہے۔	(۷) اس کا منکر کافر نہیں ہے۔
(۸) اس عقیدے میں کوئی اشتباہ لاحق نہیں ہوتا۔	(۸) اشتباہ لاحق ہو جانا ممکن ہے۔
(۹) صحابہ کرام سے لے کر آج تک تمام مسلمان اس کو قطعی الثبوت اور متواتر جانتے ہیں۔	(۹) بعض صحابہ کے آثار سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اسے قطعی الثبوت اور متواتر نہیں جانتے تھے۔
(۱۰) اس عقیدے سے اختلاف کرنے والا قادیانی (کافر) ہے۔	یہ ایک علمی نوعیت کا اختلاف ہوگا جس پر دلائل کی روشنی میں شائستگی ہی سے تنقید کرنی چاہئے اور اس مسئلے کو ایمانیات کی بجائے احادیث کے حوالے سے بحث اور تحقیق کے درجہ میں ہی رکھنا چاہئے۔

تلك عشرة كاملة

اس تقابلی موازنہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ عمار خان ناصر نے اپنے جد امجد، امام اہل سنت حضرت مولانا سرفراز خان صاحب صفدرؒ کی تردید میں یہ سطور تحریر کی ہیں۔

جاوید غامدی کی شاگردی کے اثرات:

جناب عمار خان ناصر نے عقیدہ حیات عیسیٰ علیہ السلام میں کھل کر اپنے جد امجد کی مخالفت کی ہے۔ اور اہل اسلام میں سے کوئی ایک عالم دین ایسا نہیں ہے جس نے عمار خان ناصر والا نظریہ اپنایا ہو۔ کیونکہ بقول امام اہل سنتؒ کے کسی صدی میں کسی عالم دین نے یہ نظریہ نہیں اپنایا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ موصوف نے یہ نظریہ کہاں سے پایا؟ تو ظاہر ہے کہ عمار خان ناصر نے اس عقیدہ کو کھوکھلا کرنے کے ہتھیار بدنام زمانہ مشہور ملحد جاوید غامدی سے حاصل کیے ہیں۔ اور علماء اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جاوید غامدی ملحد اور زندیق ہے اور بقول مولانا زاہد الراشدی کے عمار خان ناصر ان کا شاگرد اور وظیفہ کار رہا ہے۔ اور یہ بات بھی